باب ہفتم

اعجازِقرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ

قرآن اور صاحبِ قرآنؐ کا باہمی تعلق

میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن مجید اور نبی اکرمﷺ دونوں ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔قرآن کے منزَّل مِن اللہ ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے معتبر خارجی گواہی نبی اکرمﷺ کی اپنی گواہی ہے۔آپؐ کی شخصیت‘ آپؐ کا کردار‘ آپؐ کا چہرۂ انور اپنی اپنی جگہ پر گواہ ہیں۔ ہمارے لیے اگرچہ آپﷺ کی سیرت آج بھی زندہ و پائندہ ہے‘ کتابوں میں درج ہے‘ لیکن ایک مجسم انسانی شخصیت کی صورت میں آپﷺ ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں‘ ہم آپﷺ کے روئے انور کی زیارت سے محروم ہیں۔تاہم آپﷺ کا کارنامہ زندہ و تابندہ ہے اور اس کی گواہی ہر شخص دے رہا ہے۔ہر مؤرخ نے تسلیم کیا ہے‘ ہر مفکر نے مانا ہے کہ تاریخ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ تھا جو حضورﷺ نے برپا کیا۔آپؐ کی یہ عظمت آج بھی مبرہن ہے‘ آشکارا ہے‘ اظہر من الشّمس ہے۔چنانچہ قرآن کے منزَّل مِن اللہ اور کلام الٰہی ہونے پر سب سے بڑی خارجی گواہی خود نبی اکرمﷺ ہیں‘ اور نبی اکرمﷺ کے نبی اور رسول ہونے کا سب سے بڑا گواہ‘ سب سے بڑا شاہد اور سب سے بڑا ثبوت خود قرآن مجید ہے۔

اس اعتبار سے یہ دونوں جس طرح لازم وملزوم ہیں اس کے لیے میں قرآن حکیم کے دو مقامات سے استشہاد کر رہا ہوں۔سورۃ البیّنہ میں فرمایا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ A﴾

’’اہل کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اور مشرک باز آنے والے نہ تھے یہاں تک کہ اُن کے پاس ’بیّنہ‘ آ جاتی‘‘۔

’’بیّنة‘‘ کھلی اور روشن دلیل کو کہتے ہیں۔ایسی بالکل روشن حقیقت جس کو کسی خارجی دلیل کی مزید حاجت نہ ہو وہ ’’بیّنہ‘‘ ہے۔جیسے ہم اپنی گفتگو میں کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل بیّن ہے‘ بالکل واضح ہے‘ اس پر کسی قیل وقال کی حاجت ہی نہیں ہے۔بلکہ اگر بیّنہ پر کوئی دلیل لانے کی کوشش کی جائے تو کسی درجے میں شک وشبہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے‘ اس پر یقین میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔اور یہ بیّنہ کیا ہے؟ فرمایا:

﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً B فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ X﴾

’’ایک رسول اللہ کی جانب سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا ہے‘ جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں‘‘۔

یہاں قرآن حکیم کی سورتوں کو اللہ کی کتابوں سے تعبیر کیا گیا ہے‘ جو قائم و دائم ہیں اور ہمیشہ ہمیش رہنے والی ہیں۔تو گویا رسولؐ کی شخصیت اور اللہ کا یہ کلام جو اُن پر نازل ہوا‘ دونوں مل کر ’’بیّنہ‘‘ بنتے ہیں۔

میں نے قرآن فہمی کا یہ اصول بارہا عرض کیا ہے کہ قرآن مجید میں اہم مضامین کم سے کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔چنانچہ اس کی نظیر سورۃ الطلاق میں موجود ہے۔اس کی آیت ۱۰ اِن الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ϑ﴾ ’’اللہ نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کر دیا ہے‘‘۔اور یہ ذکر کیا ہے؟ فرمایا: ﴿رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط﴾ ’’ایک ایسا رسول جو تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہے اللہ کی آیات جو ہر شے کو روشن کر دینے والی (اور ہر حقیقت کو مبرہن کر دینے والی) ہیں‘ تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے‘‘۔یہاں ’’اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ‘‘ کے بجائے ’’اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ‘‘ آیا ہے۔’’بیّن‘‘ وہ چیز ہے جو خود روشن ہے اور ’’مُبَیِّن‘‘ وہ چیز ہے جو دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہے‘ حقائق کو اجاگر کرتی ہے۔تو یہاں پر ذکر کی جو تاویل کی گئی کہ ﴿رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ﴾ اس

سے واضح ہوا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے اور ملے ہوئے ہیں کہ ایک حیاتیاتی وجود (Organic Whole) بن گئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لیے شاہد بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے complimentary بھی ہیں۔ اس حوالے سے یہ دونوں حقیقتیں اس طرح جمع ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جاسکتیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ: قرآن حکیم

اگلی بات یہ سمجھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا بالفاظِ دیگر آپؐ کا اصل معجزہ‘ بلکہ واحد معجزہ قرآن حکیم ہے۔ یہ بات ذرا اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ ’’معجزہ‘‘ کا لفظ ہمارے ہاں بہت عام ہو گیا ہے اور ہر خرقِ عادت شے کو معجزہ شمار کیا جاتا ہے۔ معجزہ کے لفظی معنی عاجز کر دینے والی شے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ’’عجز‘‘ مادہ سے بہت سے الفاظ آتے ہیں‘ لیکن ہمارے ہاں اصطلاح کے طور پر اس لفظ کا جو اطلاق کیا جاتا ہے وہ قرآن حکیم میں مستعمل نہیں ہے‘ بلکہ اللہ کے رسولوں کو جو معجزات دیے گئے انہیں بھی آیات کہا گیا ہے۔ انبیاء ورُسل اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی اللہ کی نشانیاں لے کر آئے۔

اس اعتبار سے معجزہ کا لفظ جس معنی میں ہم استعمال کرتے ہیں‘ اس معنی میں یہ قرآن مجید میں مستعمل نہیں ہے۔ البتہ وہ طبیعی قوانین (Physical Laws) جن کے مطابق یہ دنیا چل رہی ہے‘ اگر کسی موقع پر وہ ٹوٹ جائیں اور ان کے ٹوٹ جانے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی مشیتِ خصوصی ظاہر ہو تو اسے خرقِ عادت کہتے ہیں۔ مثلاً قانون تو یہ ہے کہ پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے‘ لیکن حضرت موسیٰ d نے اپنے عصا کی ضرب لگائی اور سمندر پھٹ گیا‘ یہ خرقِ عادت ہے‘ یعنی جو عادی قانون ہے وہ ٹوٹ گیا۔ ’’خرق‘‘ پھٹ جانے کو کہتے ہیں‘ جیسے سورۃ الکہف میں یہ لفظ آیا ہے ’’خَرَقَهَا‘‘ یعنی اس اللہ کے بندے نے جو حضرت موسیٰ d کے ساتھ کشتی میں سوار تھے‘ کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ پس جب بھی کوئی طبیعی قانون ٹوٹے گا تو وہ خرقِ عادت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ان خرقِ عادت واقعات کے ذریعے سے بہت سے قوانینِ قدرت کو توڑ کر اپنی خصوصی مشیت اور خصوصی قدرت کا اظہار فرماتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے ہاں مسلّم ہے کہ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے‘ بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے بھی جن کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا چاہے کرتا ہے‘ لیکن اصطلاحاً ہم انہیں کرامات کہتے ہیں۔ خرقِ عادت یا کرامات اپنی جگہ پر ایک مستقل مضمون ہے۔

معجزہ بھی خرقِ عادت ہوتا ہے‘ لیکن رسول کا معجزہ وہ ہوتا ہے جو دعوے کے ساتھ پیش کیا جائے اور جس میں تحدّی (challenge) بھی موجود ہو۔ یعنی جسے رسول خود اپنی رسالت کے ثبوت کے طور پر پیش کرے اور پھر اُس میں مقابلے کا چیلنج دیا جائے۔ جیسے حضرت موسیٰ d کو اللہ تعالیٰ نے جو معجزات عطا کیے ان میں ’’یدِ بیضا‘‘ اور ’’عصا‘‘ کی حیثیت اصل معجزے کی تھی۔ ویسے آیات اور بھی دی گئی تھیں جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ﴾ ’’اور بیشک ہم نے موسیٰ کو نو روشن نشانیاں دیں‘‘۔ مگر یہ اُس وقت کی بات ہے جب آپؑ ابھی مصر کے اندر تھے۔ پھر جب آپؑ مصر سے باہر نکلے تو عصا کی کرامات ظاہر ہوئیں کہ اس کی ضرب سے سمندر پھٹ گیا‘ اس کی ضرب سے چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ تمام چیزیں خرقِ عادت ہیں‘ لیکن اصل معجزے دو تھے جن کو حضرت موسیٰ d نے دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ یہ میری رسالت کا ثبوت ہے۔

جب آپؑ فرعون کے دربار میں پہنچے اور آپ نے اپنی رسالت کی دعوت پیش کی تو دلیلِ رسالت کے طور پر فرمایا کہ میں اس کے لیے سند (سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ) بھی لے کر آیا ہوں۔ فرعون نے کہا کہ لاؤ پیش کرو تو آپؑ نے یہ دو معجزے پیش کیے۔ یہ دو معجزے جو اللہ کی طرف سے آپؑ کو عطا کیے گئے‘ آپؑ کی رسالت کی سند تھے۔ اس میں تحدّی بھی تھی۔ لہٰذا مقابلہ بھی ہوا اور جادوگروں نے پہچان بھی لیا کہ یہ جادو نہیں ہے‘ معجزہ ہے۔ معجزہ جس میدان کا ہوتا ہے اسے اُسی میدان کے افراد ہی پہچان سکتے ہیں۔ جب جادوگروں کا حضرت موسیٰ d سے مقابلہ ہوا تو عام دیکھنے والوں نے تو یہی سمجھا ہو گا کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور یہ چھوٹے جادوگر ہیں‘ اس کا جادو زیادہ طاقتور نکلا‘ اس کے عصا

نے بھی سانپ اور اژدھا کی شکل اختیار کی تھی اور ان جادوگروں کی رسیوں اور چھڑیوں نے بھی سانپوں کی شکل اختیار کر لی تھی' البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کا بڑا سانپ باقی تمام سانپوں کو نگل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجمع ایمان نہیں لایا' لیکن جادوگر تو جانتے تھے کہ اُن کے فن کی رسائی کہاں تک ہے' اس لیے اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ جادو نہیں ہے' کچھ اور ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم کے معجزہ ہونے کا اصل احساس عرب کے شعراء' خطیبوں اور زبان دانوں کو ہوا تھا۔ عام آدمی نے بھی اگرچہ محسوس کیا کہ یہ خاص کلام ہے' بہت پُرتاثیر اور میٹھا کلام ہے' لیکن اس کا معجزہ ہونا یعنی عاجز کر دینے والا معاملہ تو اسی طرح ثابت ہوا کہ قرآن مجید میں بار بار چیلنج دیا گیا کہ اس جیسا کلام پیش کرو۔ اس اعتبار سے جان لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ قرآن ہے۔

آپ ﷺ کے خرقِ عادت معجزات تو بے شمار ہیں۔ شقّ قمر قرآن حکیم سے ثابت ہے' لیکن یہ آپ ﷺ نے دعوے کے ساتھ نہیں دکھایا' نہ ہی اِس پر کسی کو چیلنج کیا' بلکہ آپؐ سے جو مطالبے کیے گئے تھے کہ آپؐ یہ یہ کرکے دکھایئے' اُن میں سے کوئی بات اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور نہیں ہوئی۔ اللہ چاہتا تو اُن کا مطالبہ پورا کرا دیتا' لیکن اُن مطالبوں کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ البتہ خرقِ عادت واقعات بے شمار ہیں۔ جانوروں کا بھی آپؐ کی بات کو سمجھنا اور آپؐ سے عقیدت کا اظہار کرنا بہت مشہور ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ۶۳ اونٹوں کو حضور ﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے نحر کیا تھا۔ قطار میں سو اونٹ کھڑے کیے گئے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک اونٹ جب گرتا تھا تو اگلا خود آگے آ جاتا تھا۔ اسی طرح ''ستونِ حنانہ'' کا معاملہ ہوا۔ حضور ﷺ مسجد نبویؐ میں کھجور کے ایک تنے کا سہارا لے کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے' مگر جب اِس مقصد کے لیے منبر بنا دیا گیا اور آپؐ پہلی مرتبہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے تو اُس سوکھے ہوئے تنے میں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو' اسی لیے تو اسے ''حنّانہ'' کہتے ہیں۔ ایسے ہی کئی مواقع پر تھوڑا کھانا بہت سے لوگوں کو کفایت کر گیا۔

اِن خرقِ عادت واقعات کو بعض عقلیت پسند (Rationalists) اور سائنسی مزاج کے حامل لوگ تسلیم نہیں کرتے۔ پچھلے زمانے میں بھی لوگ ان کا انکار کرتے رہے ہیں۔ اس پر مولانا روم نے خوب فرمایا ہے کہ: ؎

فلسفی کو منکرِ حنّانہ است
از حواسِ انبیا بیگانہ است!

بہرحال خرقِ عادت واقعات حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بہت ہیں۔ (تفصیل دیکھنا ہو تو ''سیرت النبیؐ'' از مولانا شبلی کی ایک ضخیم جلد صرف حضور ﷺ کے خرقِ عادت واقعات پر مشتمل ہے) لیکن جیسا کہ اوپر گزرا' معجزہ دعوے کے ساتھ اور رسالت کے ثبوت کے طور پر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال حضرت عیسیٰؑ کی آئی ہے کہ آپؑ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو میں مُردوں کو زندہ کر کے دکھا رہا ہوں۔ میں گارے سے پرندے کی صورت بناتا ہوں اور اُس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اڑتا ہوا پرندہ بن جاتا ہے۔ خرقِ عادت کا معاملہ تو غیر نبی کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے لیے بھی اس طرح کے حالات پیدا کر سکتا ہے۔ اُن کا اللہ کے ہاں جو مقام و مرتبہ ہے اس کے اظہار کے لیے کرامات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ یہ چیزیں بعید نہیں ہیں' لیکن انبیاء کی کرامات کو عرفِ عام میں ''معجزات'' کہا جاتا ہے اور غیر انبیاء اور اولیاء کے لیے ''کرامات'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معجزہ وہ ہے جسے اللہ کا رسول دعوے کے ساتھ پیش کرے اور چیلنج کرے۔

یہ بات کہ قرآن مجید ہی حضور ﷺ کا اصل معجزہ ہے' دو اعتبارات سے قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ ایک مثبت انداز ہے' جیسے سورۂ یٰسٓ کی ابتدائی آیات میں فرمایا: ﴿یٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۝ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝﴾ ''یٰسٓ۔ قسم ہے قرآن حکیم کی (اور قسم کا اصل فائدہ شہادت ہوتا ہے' یعنی گواہ ہے یہ قرآن حکیم) کہ یقیناً (اے محمد ﷺ) آپ اللہ کے رسول ہیں''۔ خطاب بظاہر حضور ﷺ سے ہے' حالانکہ

حضورؐ کو یہ بتانا مقصود نہیں ہے‘ بلکہ مخاطبین یعنی اہل عرب اور اہل مکّہ کو سنایا جارہا ہے کہ یہ قرآن شاہد ہے‘ یہ ثبوت ہے‘ یہ دلیلِ قطعی ہے کہ محمدﷺ اللہ کے رسول ہیں‘ یہ قرآن پکار پکار کر محمد رسول اللہﷺ کی رسالت کا ثبوت پیش کررہا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم کے چار مقامات اور ہیں جن میں یہی آیت ﴿اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ مقدر ہے‘ اگرچہ بیان نہیں ہوئی۔ سورۃ صٓ کا آغاز ہوتا ہے: ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ A بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّۃٍ وَّشِقَاقٍ B﴾ ’’ص‘ قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت (یاددہانی) والا ہے۔ لیکن وہ لوگ کہ جو منکر ہیں‘ گھمنڈ اور ضد میں پڑے ہوئے ہیں‘‘۔ یہاں ’’صٓ‘‘ ایک حرف ہے‘ لیکن اس سے آیت نہیں بنی‘ جبکہ ’’یٰسٓ‘‘ ایک آیت ہے۔ سورۃ صٓ کی پہلی آیت قسم پر مشتمل ہے۔ ’’بَلْ‘‘ سے جو دوسری آیت شروع ہو رہی ہے یہ ثابت کر رہی ہے کہ مُقسَم علیہ (جس چیز پر قسم کھائی جارہی ہے) یہاں محذوف ہے اور وہ (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) ہے۔ گویا کہ معناً اسے یوں پڑھا جائے گا: ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ A (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا......﴾. اسی طرح سورۃ قٓ میں ہے: ﴿قٓ ج وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ A (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) بَلْ عَجِبُوْا اَنْ جَآءَ ھُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْھُمْ ......﴾.

ایسے ہی دو سورتیں الزخرف اور الدخان ’’حٰمٓ‘‘ سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کی پہلی دو آیات بالکل ایک جیسی ہیں: ﴿حٰمٓ A وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ B﴾. پہلی آیت حروفِ مقطعات پر اور دوسری آیت قَسم پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد مُقسَم علیہ (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) محذوف ماننا پڑے گا۔ گویا: ﴿حٰمٓ A وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ B (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ X﴾ اور: ﴿حٰمٓ A وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ B (اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ) اِنَّا اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ اِنَّا کُنَّا مُنْذِرِیْنَ X﴾.

یہ ایک اسلوب ہے کہ محمد رسول اللہﷺ کی رسالت کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کی قسم کھائی گئی‘ یعنی قرآن کی گواہی اور شہادت پیش کی گئی۔ یہ اِس بات کو کہنے کا ایک اسلوب ہے کہ حضورﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا آپؐ کا اصل معجزہ قرآن ہے۔

قرآن کا دعویٰ اور چیلنج

پہلے گزر چکا ہے کہ معجزے میں تحدّی (چیلنج) بھی ضروری ہے اور دعویٰ بھی۔ لہٰذا وہ مقامات گن لیجیے جن میں چیلنج ہے کہ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ محمدﷺ کا کلام ہے‘ انسانی کلام ہے جسے محمدﷺ نے خود گھڑ لیا ہے‘ یہ اُن کی اپنی اختراع ہے تو تم مقابلہ کرو اور ایسا ہی کلام پیش کرو۔ قرآن مجید میں ایسے پانچ مقامات ہیں۔ سورۃ الطّور میں فرمایا:

﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَہٗ ج بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ γ فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِہٖ اِنْ کَانُوْا صٰدِقِیْنَ η﴾

’’کیا اُن کا یہ کہنا ہے کہ یہ محمدؐ نے خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں۔ پھر چاہیے کہ وہ اسی طرح کا کوئی کلام پیش کریں اگر وہ سچے ہیں‘‘۔

قَالَ‘ یَقُوْلُ کا معنی ہے کہنا۔ جبکہ تَقَوَّلَ‘ یَتَقَوَّلُ کا مفہوم ہے تکلف کر کے کہنا‘ یعنی محنت کر کے کلام موزوں کرنا (جس کے لیے انگریزی میں composition کا لفظ ہے۔) تو کیا اُن کا خیال ہے کہ یہ محمدﷺ نے خود کہہ لیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں‘ لہٰذا اس طرح کی کٹ حجتیاں کر رہے ہیں۔ اگر یہ سچے ہیں تو ایسا ہی کلام پیش کریں۔ آخر یہ بھی انسان ہیں‘ اِن میں بڑے بڑے شعراء اور بڑے قادر الکلام خطیب موجود ہیں۔ ان میں وہ شعراء بھی ہیں جن کو دوسرے شعراء سجدہ کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب مل کر ایسا کلام پیش کریں۔

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا φ﴾

’’(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمام جن و اِنس جمع ہو جائیں (اور اپنی پوری قوت و صلاحیت اور اپنی تمام ذہانت و فطانت‘ قادر الکلامی کو جمع کر کے کوشش کریں) کہ اِس قرآن جیسی کتاب پیش کر دیں تو وہ ہرگز ایسی کتاب نہیں

لا سکیں گے چاہے وہ ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں''۔

یہ تو بحیثیت مجموعی پورے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے سے مخلوق کے عاجز ہونے کا دعویٰ ہے جو قرآن مجید نے دو مقامات پر کیا ہے۔ سورۂ یونس میں اس سے ذرا نیچے اتر کر' جسے برسبیل تنزّل کہا جاتا ہے' فرمایا کہ پورے قرآن کی نظیر نہیں لا سکتے تو ایسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ! ارشاد ہوا:

﴿اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِعَشۡرِ سُوَرٍ مِّثۡلِہٖ مُفۡتَرَیٰتٍ وَّادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۝﴾ (ھود)

''کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود گھڑ کر لے آیا ہے؟ (اے نبیؐ! ان سے) کہیے پس تم بھی دس سورتیں بنا کر لے آؤ ایسی ہی گھڑی ہوئی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو''۔

اس کے بعد دس سے نیچے اتر کر ایک سورۃ کا چیلنج بھی دیا گیا:

﴿اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّثۡلِہٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۝﴾ (یونس)

''کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود بنا کر لے آیا ہے؟ (اے نبیؐ! ان سے) کہیے پس تم بھی ایک سورت بنا کر لے آؤ ایسی ہی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو''۔

یہ چاروں مقامات تو مکی سورتوں میں ہیں۔ پہلی مدنی سورۃ ''البقرۃ'' ہے۔ اس میں بڑے اہتمام کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے:

﴿وَاِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ۪ وَادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ۝ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُہَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَۃُ ۚۖ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ۝﴾

''اگر تم لوگوں کو شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورۃ تم بھی (موزوں کر کے) لے آؤ اور اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو (ان سب کو جمع کر لو) اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو' اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے' تو بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے' یہ منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے''۔

یہاں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ حقیقت میں تم سچے نہیں ہو' تمہارا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے' لیکن چونکہ تم زبان سے تنقید کر رہے ہو اور جھٹلا رہے ہو تو اگر واقعتاً تمہیں شک ہے تو اِس شک کو رفع کرنے کے لیے ہمارا یہ چیلنج موجود ہے۔

یہ ہیں قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے دو اسلوب۔ ایک مثبت انداز ہے کہ قرآن گواہ ہے اس پر کہ اے محمدﷺ! آپ اللہ کے رسول ہیں' اور دوسرا انداز چیلنج کا ہے کہ اگر تمہیں اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس جیسا کلام تم بھی بنا کر لے آؤ۔

قرآن کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟

اب اس ضمن میں تیسری ذیلی بحث یہ ہوگی کہ قرآن مجید کس کس اعتبار سے معجزہ ہے۔ یہ مضمون اتنا وسیع اور اتنا متنوّع الاطراف ہے کہ ''وجوہِ اعجاز القرآن'' پر پوری پوری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر بات ہے اس وقت اِس کا احاطہ مقصود نہیں ہے' صرف موٹی موٹی باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

اصل شے تو اِس کی تأثیر قلب ہے کہ یہ دل کو لگنے والی بات ہے۔ اس کا اصل اعجاز یہی ہے کہ یہ دل کو جا کر لگتی ہے بشرطیکہ پڑھنے والے کے اندر تعصب' ضد اور ہٹ دھرمی نہ ہو اور اسے زبان سے اتنی واقفیت ہو جائے کہ براہِ راست قرآن اس کے دل پر اتر سکے۔ یہ قرآن کے اعجاز کا اصل پہلو ہے۔ لیکن اضافی طور پر جان لیجیے کہ جس وقت قرآن نازل ہوا اُس وقت کے اعتبار سے اس کے معجزہ ہونے کا نمایاں اور اہم تر پہلو اِس کی ادبیت' اِس کی فصاحت و بلاغت' اس میں الفاظ کا انتخاب' بندشیں اور ترکیبیں' اس کی مٹھاس اور اس کا صوتی آہنگ ہے۔ یہ درحقیقت نزول کے وقت قرآن کے معجزہ ہونے کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ہر رسول کو اُسی طرز کا معجزہ دیا گیا جن چیزوں کا

اُس کے زمانے میں سب سے زیادہ چرچا اور شغف تھا۔ حضرت موسیٰd کے زمانے میں جادو عام تھا لہٰذا مقابلے کے لیے آپؑ کو وہ چیزیں دی گئیں جن سے آپؑ جادوگروں کو شکست دے سکیں۔ حضورﷺ نے جس قوم میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اُس قوم کا اصل ذوق قدرتِ کلام تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اصل میں بولنے والے تو ہم ہی ہیں' باقی دنیا تو گونگی ہے۔ ان کی زبان دانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی پسند کی اشیاء کے نام رکھنا شروع کرتے تو ہزاروں نام رکھ دیتے۔ چنانچہ عربی میں شیر اور تلوار کے لیے پانچ پانچ ہزار الفاظ ہیں۔ گھوڑے اور اونٹ کے لیے لاتعداد الفاظ ہیں۔ یہ اُن کی قادرالکلامی ہے کہ کسی شے کو اُس کی ہر ادا کے اعتبار سے نیا نام دے دیتے۔ گھوڑا اُن کی بڑی محبوب شے ہے' لہٰذا اُس کے نامعلوم کتنے نام ہیں۔ شعر و شاعری میں ان کے ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ اُن کے ہاں سالانہ مقابلے ہوتے تھے تاکہ اس سال کے سب سے بڑے شاعر کا تعین کیا جائے۔ شعراء اپنے اپنے قصیدے لکھ کر لاتے تھے' مقابلہ ہوتا تھا۔ پھر جب فیصلہ ہوتا تھا کہ کس کا قصیدہ سب پر بازی لے گیا ہے تو باقی تمام شعراء اس کی عظمت کے اعتراف کے طور پر اُس کو سجدہ کرتے تھے۔ پھر وہ قصیدہ خانۂ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا جاتا تھا کہ یہ ہے اس سال کا قصیدہ۔ چنانچہ اس طرح کے سات قصیدے خانہ کعبہ میں آویزاں کیے گئے تھے جنہیں ''سَبْعَة مُعَلَّقَة'' کہا جاتا تھا۔ **سبعة معلقة** کے آخری شاعر حضرت لبیدh تھے جو ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے شعر کہنے چھوڑ دیئے۔ حضرت عمرh نے اُن سے کہا کہ اے لبید! اب آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟ تو جواب میں انہوں نے بڑا پیارا جملہ کہا کہ ''اَبَعْدَ الْقُرْآنِ؟'' یعنی کیا قرآن کے نزول کے بعد بھی؟ اب کسی کے لیے کچھ کہنے کا موقع باقی ہے؟ قرآن کے آجانے کے بعد کوئی اپنی فصاحت و بلاغت کے اظہار کی کوشش کر سکتا ہے؟ گویا زبانیں بند ہو گئیں' اُن پر تالے پڑ گئے' ملک الشعراء نے شعر کہنے چھوڑ دیے۔

جن لوگوں کی مادری زبان عربی ہے وہ آج بھی قرآن کے اِس اعجاز کو محسوس کر سکتے ہیں۔ غیر عرب لوگوں کے لیے اس کو محسوس کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی اپنی محنت سے عربی ادب کے اندر مولانا علی میاں(۱) کی سی مہارت حاصل کر لے تو وہ واقعتاً اس کو محسوس کر سکے گا اور اس کی تحسین کر سکے گا کہ فصاحت و بلاغت میں قرآن کا کیا مقام ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے' البتہ اس کا صوتی آہنگ ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی قراءت کے اندر ایک معجزانہ تأثیر ہے جو قلب کے اندر عجیب کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔ قرآن کا صوتی آہنگ ہماری فطرت کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ قرآن کی یہ معجزانہ تأثیر آج بھی ویسی ہے جیسی نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ اس میں مرورِ ایام سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت' اس کی ادبیت' عذوبت اور اس کے صوتی آہنگ کی معجزانہ تأثیر پر مستزاد عہدِ حاضر میں قرآن کے اعجاز کے ضمن میں جو چیزیں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں اُن میں سے ایک چیز تو وہ ہے جس کا قرآن مجید نے بڑے صریح الفاظ میں ذکر کیا ہے:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ﴾
(حٰمٓ السجدۃ:۵۳)

''ہم عنقریب انہیں اپنی آیات دکھائیں گے آفاق میں بھی اور اُن کی اپنی جانوں میں بھی یہاں تک کہ یہ بات اُن پر واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے۔''

اِس آیت مبارکہ میں علمِ انسانی کے دائرہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور جدید اکتشافات وانکشافات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ آیاتِ آفاقی ہیں۔ فرانسیسی سرجن ڈاکٹر مورس بکائی کا پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس نے کہا کہ میرا دل اس پر مطمئن ہو گیا ہے کہ اس قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے سائنس نے غلط ثابت کیا ہو۔ البتہ اُس دَور میں جبکہ انسان کا اپنا ذہنی ظرف وسیع نہیں ہوا تھا' علومِ انسانی اور معلوماتِ انسانی کا دائرہ محدود تھا' اس وقت سائنسی اشارات کی حامل آیاتِ قرآنیہ کا کیا مفہوم سمجھا گیا' وہ بات اور ہے۔ کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے

(۱) مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی جواب وفات پا چکے ہیں' يَغْفِرُ اللّٰهُ لَهٗ وَيَرْفَعَ دَرَجَاتِهٖ فِى الْجَنَّةِ آمِيْن!

اصل اہمیت تو قرآن کے الفاظ کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے قرآن کا تورات کے ساتھ تقابل کیا ہے! تورات سے مراد Old Testament ہے۔ اناجیلِ اربعہ جو حضرت عیسیٰd کی طرف منسوب ہیں' اُن میں تو کئی چیزیں ایسی ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اناجیل میں زیادہ تر اخلاقی مواعظ ہیں یا پھر حضرت عیسیٰd کے سوانح حیات ہیں۔ تورات میں یہ مباحث موجود ہیں کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی' اللہ نے کیسے اسے بنایا۔ مختلف سائنسی phenomena اس میں موجود ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ فزکس میں آج سب سے زیادہ اہم موضوع جس پر تحقیق ہو رہی ہے' یہی ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی' ابتدائی حالات کیا تھے اور بعدازاں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے اس اعتبار سے محسوس کیا کہ تورات میں تو ایسی چیزیں ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اس لیے کہ اصل تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہو گئی تھی۔ بخت نصر کے حملے میں یروشلم کو تہس نہس کر دیا گیا اور ہیکلِ سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی' اس کی بنیادیں تک کھود ڈالی گئیں اور یروشلم کے بسنے والے چھ لاکھ کی تعداد میں قتل کر دیے گئے جبکہ بخت نصر چھ لاکھ کو قیدی بنا کر بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے اپنے ہمراہ بابل لے گیا۔ چنانچہ یروشلم میں ایک متنفس بھی باقی نہیں رہا۔ آپ اندازہ کریں' اگر یہ اعداد و شمار صحیح ہیں تو حضرت مسیحd سے بھی چھ سو سال قبل یعنی آج سے ۲۶۰۰ برس قبل یروشلم بارہ لاکھ کی آبادی کا شہر تھا اور اس شہر پر کیا قیامت گزری ہو گی! اس کے بعد سے وہ اصل تورات دنیا میں نہیں ہے۔ موسیٰ d کو جو احکامِ عشرہ (Ten Commandments) دیے گئے تھے وہ پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے تھے۔ یہ تختیاں بھی لاپتہ ہو گئیں اور باقی تورات کا وجود بھی باقی نہ رہا۔ قرآن حکیم میں ''صُحُفِ اِبْرٰھِیْمَ وَمُوْسٰی '' کا ذکر ہے۔ موسیٰd کے صحیفے پانچ ہیں جو عہد نامۂ قدیم (Old Testament) کی پہلی پانچ کتابیں ہیں۔ سانحۂ یروشلم کے قریباً ڈیڑھ سو برس بعد لوگوں نے تورات کو اپنی یادداشتوں سے مرتب کیا۔ چنانچہ اُس وقت کی نوعِ انسانی کی ذہنی اور علمی سطح جو تھی وہ اِس پر لازمی طور پر اثر انداز ہوئی۔

ڈاکٹر مورس بکائی کے علاوہ میں ڈاکٹر کیتھ این مور کا حوالہ بھی دے چکا ہوں کہ وہ قرآن حکیم میں علمِ جنین سے متعلق اشارات پا کر کس قدر حیران ہوا کہ یہ معلومات چودہ سو برس پہلے کہاں سے آ گئیں! فزیکل سائنسز کے مختلف فیلڈ ہیں' ان میں جیسے جیسے علمِ انسانی ترقی کرتا جائے گا یہ بات مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی کہ یہ کلام حق ہے اور یہ کلام مظاہرِ طبیعی کے اعتبار سے بھی حق ثابت ہو رہا ہے۔ یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمدﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

عہدِ حاضر کے اعتبار سے قرآن حکیم کے اعجاز کا دوسرا اہم تر پہلو اِس کی ہدایتِ عملی ہے۔ اس میں انفرادی زندگی سے متعلق بھی مکمل ہدایات ہیں اور انسانی اخلاق و کردار اور انسان کے رویّہ کے بارے میں بھی پوری تفصیلات موجود ہیں۔ انفرادی زندگی سے متعلق یہ تمام چیزیں سابقہ انبیاء کی تعلیمات میں بھی موجود ہیں۔ یہ اخلاق اقدار ویسے بھی فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہیں۔ قرآن کا اپنا کہنا ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَاH﴾ (الشّمس) یعنی نفسِ انسانی کو الہامی طور پر یہ معلوم ہے کہ فجور کیا ہیں اور تقویٰ کیا ہے۔ پرہیزگاری کسے کہتے ہیں اور بدکاری کسے کہتے ہیں۔ البتہ قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس میں عدل و قسط پر مبنی اجتماعی نظام دیا گیا ہے جس میں انتہائی توازن رکھا گیا ہے۔

انسان غور کرے تو معلوم ہو گا کہ نوعِ انسانی کو تین بڑے بڑے عقدہ ہائے لاینحل (dilemmas) درپیش ہیں جو توازن کے متقاضی ہیں اور ان میں عدمِ توازن سے انسانی تمدن فساد اور بگاڑ کا شکار ہے۔ ان میں پہلا عقدۂ لاینحل یہ ہے کہ مَرد اور عورت کے حقوق و فرائض میں کیا توازن ہے؟ دوسرا یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین کیا توازن ہے؟ پھر تیسرا یہ کہ فرد اور ریاست یا فرد اور اجتماعیت کے مابین حقوق و فرائض کے اعتبار سے کیا توازن ہے؟ اِن تینوں معاملات میں توازن قائم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اگر فرد کو ذرا زیادہ آزادی دے دی جاتی ہے تو انارکی (chaos) پھیلتی ہے۔ آزادی کے نام پر دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے! دوسری طرف اگر فرد کی آزادی پر قدغنیں

اور بندشیں لگا دی جائیں تو وہ ردّعمل ہوتا ہے جو کمیونزم کے خلاف ہوا۔ فطرتِ انسانی اور طبیعتِ انسانی نے یہ قدغنیں قبول نہیں کیں اور اِن کے خلاف بغاوت کی۔

عورت اور مرد کے حقوق کے مابین توازن کا معاملہ بھی انتہائی حساس ہے۔ اس میزان کا پلڑا اگر ذرا سا مَرد کی جانب جھکا دیا جائے تو عورت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی' وہ بالکل بھیڑ بکری کی طرح مرد کی مِلکیت بن کر رہ جاتی ہے' اس کا کوئی تشخص نہیں رہتا اور وہ مرد کی جوتی کی نوک قرار پاتی ہے۔ لیکن اگر دوسرا پلڑا ذرا جھکا دیا جائے تو عورت کو جو حیثیت مل جاتی ہے وہ قوموں کی قسمتوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اس سے خاندانی ادارہ ختم ہو جاتا ہے اور گھر کے اندر کا چین اور سکون برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال سکینڈے نیوین ممالک ہیں۔ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روئے ارضی پر اگر جنت دیکھنی ہو تو اِن ممالک کو دیکھ لیا جائے۔ وہاں کے شہریوں کی بنیادی ضروریات کس عمدگی کے ساتھ پوری ہو رہی ہیں! وہاں علاج اور تعلیم کی سہولیات سب کے لیے یکساں ہیں اور اس ضمن میں خیرات (charity) پر پلنے والوں اور ٹیکس ادا کرنے والوں کے مابین کوئی فرق وتفاوت نہیں ہے۔ لیکن ان ممالک میں مرد اور عورت کے حقوق کے مابین توازن برقرار نہیں رکھا گیا جس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ مضمحل ہوا' بلکہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گیا اور گھر کا سکون ناپید ہو گیا۔ چنانچہ آج خودکشی کی سب سے زیادہ شرح سویڈن میں ہے۔ اس لیے کہ گھر کا سکون ختم ہو جانے کے باعث اعصاب پر شدید تناؤ ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ برقرار ہے۔ اگرچہ یہاں بھی نام نہاد طور پر بہت اونچی سطح کے لوگوں کے ہاں تو وہ صورتیں پیدا ہو گئی ہیں' تاہم مجموعی طور پر ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ ابھی کافی حد تک محفوظ ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں لفظ ''سکون'' استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الروم کی آیت ۲۱ ملاحظہ ہو:

﴿وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا
وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ط﴾

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی نوع سے جوڑے بنائے' تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔''

اگر انسان کو یہ سکون نہیں ملتا تو اگرچہ اس کی کھانے پینے کی ضروریات' جنسی تسکین اور دوسری ضروریاتِ زندگی خوب پوری ہو رہی ہوں لیکن زندگی انسان کے لیے جہنم بن جائے گی۔

مذکورہ بالا تین عقدہ ہائے لاینحل میں سے معاشیات کا مسئلہ سب سے مشکل ہے۔ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع دیں گے تو صورت حال ایک انتہا کو پہنچ جائے گی اور مزدور کا بدترین استحصال ہو گا' جبکہ مزدور کو زیادہ حقوق دے دیں گے تو سرمائے کو کوئی تحفظ حاصل نہیں رہے گا۔ اگر نیشنلائزیشن ہو جائے تو لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ ہی نہیں رہتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں نیشنلائزیشن کے بعد کیا ہوا! روس کی اقتصادی موت کی اہم وجہ یہی نیشنلائزیشن تھی۔ تو اب سرمائے اور محنت میں توازن کے لیے کیا شکل اختیار کی جائے؟ یہ ہے درحقیقت عہد حاضر میں قرآن کی ہدایت کا اہم ترین حصہ! آج اس پر بھرپور توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ فزیکل سائنسز سے قرآن کی حقانیت کے ثبوت خود بخود ملتے چلے جائیں گے۔ جیسے جیسے سائنس ترقی کر رہی ہے نئے نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں اور ان سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ قرآن حق ہے۔ لیکن آج ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن حکیم نے عمرانیاتِ انسانیہ اور اجتماعیات مثلاً اقتصادیات' سیاسیات اور سماجیات کے ضمن میں جو عدلِ اجتماعی دیا ہے اس کو مبرہن کیا جائے۔ علامہ اقبال کے یہ دو شعر اسی حقیقت کی نشاندہی کر رہے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نور مصطفیٰ اُو را بہاست

یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است!

یعنی دنیا میں جو سوشل انقلاب آیا ہے اس کی ساری چمک دمک اور روشنی یا تو نورِ مصطفیٰ ﷺ ہی سے مستعار اور ماخوذ ہے یا پھر انسان چار و نا چار حضور ﷺ کے لائے ہوئے نظام ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ دائیں بائیں کی ٹھوکریں اور افراط و تفریط کے دھکے کھا کر لڑکھڑاتا ہوا چار و نا چار اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جہاں محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم نے اسے پہنچایا تھا۔

عہدِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا مظہر: علامہ اقبال

وجوہِ اعجازِ قرآن کے ضمن میں ایک اہم بات عرض کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک عہدِ حاضر میں قرآن کے اعجاز کا سب سے بڑا مظہر علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوا تھا۔ اس کے اوّلین مخاطب عرب کے اجڈ، دیہاتی، بدو اور ناخواندہ لوگ تھے جنہیں قرآن نے ''اُمِّیِّین'' اور ''قَوْمًا لُّدًّا'' قرار دیا ہے۔ لیکن اِس قرآن نے ان کے اندر بجلی دوڑا دی۔ اُن کے ذہن، قلب اور روح کو متأثر کیا، پھر اُن میں ولولہ پیدا کیا، ان کے باطن کو منور کیا۔ ان کی شخصیتوں میں انقلاب آیا اور افراد بدل گئے۔ پھر انہوں نے ایسی قوت کی حیثیت اختیار کی کہ جس نے دنیا کو ایک نیا تمدن، نئی تہذیب اور نئے قوانین دے کر ایک نئے دَور کا آغاز کیا —— لیکن بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسا ایک شخص جس نے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر علم حاصل کیا، جس نے مشرق و مغرب کے فلسفے پڑھ لیے، جو قدیم اور جدید دونوں کا جامع تھا، جو جرمنی اور انگلستان میں جا کر فلسفہ پڑھتا رہا، اُس کو اِس قرآن نے اس طرح possess کیا اور اس پر اس طرح اپنی چھاپ قائم کی کہ اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے اور اس کی تشنگیٔ علم کو آسودگی حاصل ہو سکی تو صرف کتاب اللہ سے۔ گویا بقول خود اُن کے ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو تیرے عفوِ بندہ نواز میں!

میرا ایک کتابچہ ''علامہ اقبال اور ہم'' ایک عرصے سے شائع ہوتا ہے۔ یہ میری ایک تقریر ہے جو میں نے ایچی سن کالج میں ۱۹۷۳ء میں کی تھی۔ اس میں مَیں نے علامہ اقبال کے لیے چند اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ''اقبال اور قرآن'' کے عنوان سے میں نے علامہ اقبال کو (۱) عظمتِ قرآن کا نشان، (۲) واقفِ مرتبہ و مقامِ قرآن، اور (۳) داعی الی القرآن کے خطابات دیے ہیں۔ میں علامہ اقبال کو اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن سمجھتا ہوں۔ قرآن مجید کے علوم و معارف کی جو تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے اس دَور میں کوئی دوسری شخصیت اس کے آس پاس بھی نہیں پہنچی۔ ان سے لوگوں نے چیزیں مستعار لی ہیں اور پھر اُن کو بڑے پیمانے پر پھیلایا ہے۔ ان حضرات کی یہ خدمت اپنی جگہ قابل قدر رہے، لیکن فکری اعتبار سے وہ تمام چیزیں علامہ اقبال کے ذہن کی پیداوار ہیں۔

مذکورہ بالا کتابچے میں مَیں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی گواہی بھی شائع کی ہے۔ کئی سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مولانا آنکھوں کے آپریشن کے لیے خانقاہ ڈوگراں سے لاہور آئے ہوئے تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تأخیر ہو رہی تھی۔ گھر سے باہر ہونے کی وجہ سے اُن کا لکھنے پڑھنے کا سلسلہ معطل ہو گیا۔ تاہم فرصت کے اُن ایّام میں مولانا نے علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام دوبارہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے دو تأثر بیان کیے۔ مولانا کا پہلا تأثر تو یہ تھا کہ ''قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے۔ لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!'' مولانا اصلاحی صاحب کا دوسرا تأثر یہ تھا کہ ''اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا حُدی خواں اِس اُمت میں پیدا ہوا، لیکن یہ اُمت ٹس سے

مس نہ ہوئی تو ہما شما کے کرنے سے کیا ہوگا!'' جو قوم علامہ اقبال کے کلام سے حرکت میں نہیں آئی اسے کون حرکت میں لا سکے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور سب سے بڑا داعی الی القرآن علامہ اقبال ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی عظمت کا جس گیرائی اور گہرائی کے ساتھ احساس علامہ اقبال کو ہوا ہے میری معلومات کی حد تک (اگرچہ میری معلومات محدود ہیں) اس درجے قرآن کی عظمت کا انکشاف کسی اور انسان پر نہیں ہوا۔ جب وہ قرآن مجید کی عظمت بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اُن کی دید اور اُن کا تجربہ ہے' کیونکہ جس انداز سے وہ بات بیان کرتے ہیں وہ تکلف اور آورد سے ماورا انداز ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے کہ علامہ اقبال قرآن مجید کے بارے میں کیا کہتے ہیں: ؎

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لا یزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا است ایں
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

''وہ زندہ کتاب' قرآن حکیم' جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!

زندگی کے وجود میں آنے کا خزینہ' جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردّ و بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔

(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!

یہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی' اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!

(یہ کتابِ حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اُس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے' اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے''۔

قرآن حکیم کے بارے میں مزید لکھتے ہیں: ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست!

''اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں''۔ (گویا ہر زمانے میں یہ قرآن ایک نئی شان اور نئی آن بان کے ساتھ دنیا میں آیا ہے اور آتا رہے گا۔)

اب آپ علامہ اقبال کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے مناجات کرتے ہوئے کہے۔ اِن سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ انہیں کتنا یقین تھا کہ میرے فکر کا منبع قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ ''مثنوی اسرار و رموز'' کے آخر میں ''عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ '' کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ: ؎

گر دِلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن

ایں خیاباں را ز خارم پاک کن!
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!

''اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو' اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور شے کی ترجمانی ہے' تو (اے نبی ﷺ!) آپ میرے ناموسِ فکر کا پردہ خود چاک فرما دیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک کر دیں۔ (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رسوا کر دیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیں!''

میں نے اپنی امکانی حد تک قرآن حکیم کا پوری باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اس پر غور و فکر اور سوچ بچار کیا ہے۔ میں نے علامہ اقبال کا اردو اور فارسی کلام بھی پڑھا ہے۔ اس کے بعد میں نے یہ بات ریکارڈ کرانی ضروری سمجھی ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں مَیں نے جو بات ۱۹۷۳ء میں کہی تھی آج بھی میں اسی بات پر قائم ہوں کہ ''اس دَور میں عظمتِ قرآن اور مرتبہ و مقامِ قرآن کا انکشاف جس شدت کے ساتھ اور جس درجہ میں علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو''۔ اور یہ کہ میرے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور داعی الی القرآن اقبال ہے۔ علامہ اقبال مسلمانوں کی قرآن سے دُوری پر مرثیہ کہتے ہیں: ؎

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں!

مسلمانوں کو قرآن کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ او آساں بمیری!

''اس قرآن کے ساتھ تمہارا اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ تم کسی شخص کو عالمِ نزع میں اِس کی سورۂ یٰسٓ سنا دو' تاکہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔''

ہمارے ہاں صوفی اور واعظ حضرات نے قرآن کو چھوڑ کر اپنی مجالس اور اپنے وعظ کے لیے کچھ اور چیزوں کو منتخب کر لیا ہے' تو اس پر اقبال نے کس قدر دردناک مرثیے کہے ہیں اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے: ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوّال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

اور ؎

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو!

''ادنیٰ لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوّال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں!

(دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پُرشکوہ اور بلند و بالا ہیں' لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے! اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمی سے' اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف' شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے!''

علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور اُمت مسلمہ کے نکبت و افلاس اور ذلت و خواری کا اصل سبب قرآن سے دُوری اور کتابِ الٰہی سے بُعد ہی

ہے۔ چنانچہ ''جوابِ شکوہ'' کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

بعد میں اسی مضمون کا اعادہ علامہ مرحوم نے فارسی میں نہایت پُرشکوہ الفاظ اور حد درجہ دردانگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ!

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے) ! اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے)۔''

میں اپنا یہ تأثر ایک بار پھر دہرا رہا ہوں کہ عصرِ حاضر میں قرآن کی عظمت جس درجہ اُن پر منکشف ہوئی تھی' میں اپنی محدود معلومات کی حد تک کہنے کو تیار ہوں کہ وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک علامہ اقبال دورِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا ایک عظیم مظہر ہیں۔

پیشکش pdf format از www.hamditabligh.net